طالبانِ علومِ نبوت کا مقام اور ان کی ذمہ داریاں

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

عزیزو اور دوستو! نبوت نے ہم کو جو علوم وحقائق اور جو اصول وضوابط عطا کئے ہیں ان میں ایک شوشہ اور ایک نقطہ کی ترمیم ممکن نہیں، آپ کے اسلاف کا یہ تجدیدی کارنامہ ہے کہ انہوں نے ان میں کوئی تحریف اور کوئی تبدیلی نہیں ہونے دی اور اس ذخیرے کو ہمارے ہاتھوں تک بے کم وکاست پہنچا دیا لیکن اسی کے ساتھ اس حقیقت کو یاد رکھئے کہ ہمارے انہیں اسلاف نے ہر دور اور ہر عصر میں اس ذخیرے کو زندگی میں منتقل کرنے کی کوشش بھی جاری رکھی، انہوں نے اپنی ذہانت اور محنت سے اس ذخیرے کو ایک زندہ قابل عمل اور نمونہ پذیر ذخیرہ ثابت کیا، انہوں نے اس کی ایسی ترجمانی اور تشریح کی کہ ان کی معاصر نسلوں کے دماغوں نے اس کو بآسانی قبول اور ہضم کیا اور ان کو اپنے زمانہ میں اپنی عقلی سطح اور ذخیرے کے درمیان کوئی تفاوت اور فاصلہ محسوس نہیں ہوا، ان میں اصل شریعت، مقاصد دین اور منصوبات کے بارے میں پہاڑوں کی سی استقامت اور فولاد کی سی صلابت تھی لیکن اس کی تعبیر وتشریح میں، اس کی توضیح وتفہیم میں شاخِ گل کی سی لچک اور ریشم کی سی نرمی تھی، ان کا عمل دراصل سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی اس حکیمانہ ہدایت پر تھا: "کلموا الناس علیٰ قدر عقولهم أتريدون أن يكذب الله و رسوله" اس لئے انہوں نے ہر زمانہ کی عقلی سطح کے مطابق دین کی تشریح و ترجمانی کا فریضہ انجام دیا، اور اس زمانہ کے نفسیات وضروریات کا لحاظ کیا۔ تیسری صدی میں مامون ومعتصم کی سرپرستی اور یونانی علوم کے اثرات سے معتزلہ دماغوں پر چھا گئے تھے اور عقلیت کے واحد نمائندہ تصور کئے جانے لگے تھے، اعتزال زمانہ کا فیشن اور روشن خیالی کی علامت بنتا جا رہا تھا، اس وقت امام ابوالحسن اشعری نے معتزلہ کی اس عقلی اجارہ داری کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور شریعت وسنت کی حمایت ونصرت اور عقائد اہل سنت کا اثبات اسی زبان، انہیں اصطلاحات اور اسی اسلوب میں کرنا شروع کیا جس کے سہارے معتزلہ نے اپنا علمی تفوق اور ذہنی سیادت قائم کی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی مدت میں معتزلہ کا یہ عقلی طلسم ٹوٹ گیا اور سنت وشریعت کے حلقوں میں جو احساس کم تری تیزی

سے پھیلتا جارہا تھا اور دفعتہ رک گیا۔ ابوبکر بن الصیر فی کا مقولہ ہے کہ "معتزلہ نے بہت سر اٹھایا تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کے مقابلے کے لئے شیخ ابوالحسن اشعری کو پیدا کیا۔ انہوں نے اپنی ذہانت واستدلال سے ان کو بند کردیا" اسی کارنامہ کی بنا پر ابوبکر اسماعیلی جیسے مبصرین نے ان کو مجددین امت میں شمار کیا ہے۔

امام ابوالحسن اشعریؒ کے بعد ان کے مکتب خیال کے علماء نے ان کے کام کو جاری رکھا اور قاضی ابوبکر باقلانی، شیخ ابواسحٰق اسفرائینی جیسے متکلم اور علامہ ابواسحٰق شیرازی اور امام الحرمین جیسے مدرس واستاذ پیدا ہوئے، جنہوں نے اہل سنت کا علمی تفوق قائم رکھا لیکن اس عرصہ میں یونان کا علمی ذخیرہ عربی میں منتقل ہوچکا تھا اور وہ عقلیت وحق کا معیار بن گیا تھا، ادھر علم کلام کے حق میں جس کو سب سے زیادہ زمانہ شناس اور بیدار مغز ہونا چاہئے تھا، جمود وتقلید سرایت کرگئی تھی، علماء کلام کو نہ صرف اس پر اصرار تھا کہ اشعری وماتریدی عقائد کو تسلیم کیا جائے بلکہ اس پر بھی اصرار تھا کہ عقائد کو ثابت کرنے کے لئے بھی وہی مقدمات ودلائل اور وہی الفاظ واصطلاحات استعمال کئے جائیں جو اشاعرہ وماتریدیہ نے استعمال کئے ہیں، حالانکہ زمانہ نئے دلائل اور نئے طرز استدلال اور نئے اجتہاد کا طالب تھا۔ امام ابوالحسن اشعری کا دور فلسفہ کا دور طفولیت تھا اور عالم اسلام میں اس کا نیا نیا تعارف ہوا تھا۔ پانچویں صدی میں وہ اپنے شباب کو پہنچ چکا تھا اور زندگی میں اپنے پنجے گاڑھ چکا تھا، اس وقت ایک نئی شخصیت نئے اجتہاد، تازہ دماغ اور نئے علم کلام کی ضرورت تھی، اس کے لئے انتظام خداوندی نے امام غزالی کو تیار کیا، امام غزالی نے اپنی تصنیفات میں اصول وعقائد اسلامیہ پر نئے انداز سے گفتگو کی اور ان کے ثبوت کے لئے ایسے مقدمات ودلائل قائم کئے جو اس زمانہ کے لحاظ سے زیادہ موثر اور اپنے اثر کے لحاظ سے زیادہ دلنشین ودل پذیر تھے، ان کے استدلال اور طریق بحث نے دین کا نیا وقار اور اہل سنت کا نیا اعتبار قائم کردیا اور ہزاروں بے چین اور مضطرب دماغوں کے لئے وہ سکون وایمان کا باعث ہوئے، اگرچہ علم کلام کے حلقہ نے اس وقت ان کی اس اہم دینی خدمت کی داد نہیں دی بلکہ علم کلام کی پرانی لکیر سے ہٹنے کی بنا پر ان پر اعتراضات کئے، جن کا جواب امام صاحب نے "**فیصل التفرقة بین الاسلام والزندقة**" میں دیا ہے لیکن بالآخر عالم اسلام نے ان کے اس مجددانہ کارنامہ کا اعتراف کیا، امام صاحب نے فلسفہ کا جواب دینے کے لئے اس کی ضرورت سمجھی کہ وہ فلسفہ کے اصل ماخذوں کا براہ راست مطالعہ کریں اور اس پر علمی تنقید کرنے کا استحقاق پیدا کرسکیں، چنانچہ انہوں نے دو سال لگ کر (جیسا کہ "**المنقذمن الضلال**" میں لکھتے ہیں) فلاسفہ کے علوم کا گہرا مطالعہ کیا اور باطنیہ کے عقائد وخیالات سے واقفیت پیدا کی، پھر انہوں نے اول **مقاصد الفلاسفہ** پھر **تھافۃ الفلاسفہ** لکھی۔ **تھافۃ الفلاسفۃ** میں انہوں نے نیا کام یہ کیا کہ ابھی تک متکلمین اسلام کی طرف سے مدافعت وجوابدہی کیا کرتے تھے جو ہمیشہ سے ایک کمزور طریقہ ہے، امام غزالیؒ نے پہلی بار فلسفہ کے شیش محل پر سنگ باری کی، ان کے اس حملہ کا اثر یہ تھا کہ بقول مغربی مؤرخینِ فلسفہ، سو برس تک فلسفہ کی عمارت ان کے حملہ سے متزلزل رہی اور تقریباً نوے سال کے بعد فلسفہ کے حلقہ نے ابن رشد کی کتاب **تھافت**

التهافه کی صورت میں امام غزالی کی کتاب کا جواب پیش کیا۔

امام غزالی کے بعد اس کی ضرورت تھی کہ فلسفہ کی بنیادوں پر منظم حملہ ہو اور نفس فلسفہ کو اعتراضات کے تیروں سے چھلنی کردیا جائے اور ثابت کیا جائے کہ فلسفہ کا سارا نظام قیاس آرائی سے زیادہ نہیں، اس کے لئے فلسفہ سے بڑی گہری اور وسیع واقفیت، ایک بڑے نقاد دماغ اور ایک بڑے جری اور طاقتور قلم کی ضرورت تھی، اس کام کے لئے شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ بڑھے، جو ہر طرح اس کے لئے موزوں تھے، انہوں نے اپنے مختلف رسائل بالخصوص اپنی تصنیف **الرد علی المنطقیین** میں فلسفہ اور اس کے پورے نظام فکر کو بے اعتبار ثابت کردیا، ان کی مجتہدانہ کتابیں اب بھی ذہن کو نئی غذا، قلوب کو نیا اعتماد اور فکر کو تازگی اور نشاط بخشتی ہیں۔

ادھر فلسفہ اور علم کلام دونوں نے مل کر جو ایک عقلی ظاہریت پیدا کردی تھی اور عالم اسلام میں اس کے اثر سے یہ غلط خیال پیدا ہوگیا تھا کہ صداقت ویقین حاصل کرنے کا راستہ صرف استدلال وفکر ہے، اس کے خلاف مولانا جلال الدین رومیؒ نے قلمی جہاد کیا، ان کی زندہ جاوید مثنوی درحقیقت ساتویں صدی کے عقلی بحران کے خلاف قلب وروح کی ایک دلکش صدائے احتجاج ہے اور نہ صرف علم کلام کی ایک مجتہدانہ تصنیف ہے بلکہ نئے علم کلام اور نئے متدل کی بنیاد ہے، انہوں نے عقائد وحقائق اسلامیہ کے ثبوت کے لئے نئے دلائل اور نئی نئی مثالیں دی ہیں، جو بیک وقت قلب ودماغ کو متاثر کرتی ہیں اور دونوں کی سلوٹوں کو دور کرتی ہوئی دلنشیں وجاگزیں ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اس کتاب کی تاثیر ابھی تک باقی ہے اور فلسفہ زدہ حلقوں میں اب بھی اس کے تیر بے خطا ہیں۔

مولانا رومؒ اور حافظ ابن تیمیہؒ کے بعد فلسفہ نے نئی کروٹ لی، اب وہ تصوف واخلاق کی سرحدوں میں بھی گھس آیا اور سیاست وانتظام میں بھی دخل دینے لگا، اب اس کی تردید کے لئے تنہا الٰہیات کے مباحث اور علم کلام کی کاوش کافی نہ تھی، اب فلسفہ کے ہمہ گیر اثرات کا مقابلہ وہ کرسکتا تھا جو یونانی الٰہیات کے ساتھ یونانیوں کے علم الاخلاق، مصر کی افلاطونیت جدیدہ اور اشراق، ہندوستان کے جوگ اور قرون وسطی کے سیاسی تخیلات پر بھی ناقدانہ نظر رکھتا ہو اور فلسفہ وتصوف، علم الاخلاق اور علم سیاست اور اسلام کے معاشی اصول اور نظام مالیات پر بھی اس کا مطالعہ وسیع اور نظر عمیق ہو، اس موقع پر شاہ ولی اللہ کی شخصیت نمودار ہوتی ہے، جنہوں نے **حجۃ اللہ البالغہ** اور **ازالۃ الخفاء** لکھ کر اسلام کی عظمت اور صداقت کا نقش قائم کردیا اور علمی حلقوں میں اسلام کی نئی علمی ساکھ، علوم اسلامیہ کی زندگی کا ثبوت اور طبقہ علماء کا وقار قائم کردیا۔

۱۸۵۷ء میں انگریزی حکومت کے تسلط سے نئے نئے فتنوں نے سر اٹھایا، عیسائی مبلغین نے اسلام پر علانیہ حملے شروع کردیئے اور علماء اسلام کو دعوت مقابلہ دی، پادریوں کا جواب دینے کے لئے اناجیل ان کی تفاسیر اور ان کی تاریخ تدوین اور مسیحیت واسلام کے مابہ النزاع مسائل ومباحث کی براہ راست مطالعہ کی ضرورت تھی اس موقع پر طبقہ علماء ہی کے ایک فرد مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی میدان میں آئے اور انہوں نے اظہار الحق اور ازالۃ الادہام جیسی کتابیں لکھ

کر مسیحیت کی اشاعت میں ایک سنگ گراں رکھ دیا یہ کتابیں ہندوستان سے لے کر مصر و ترکی تک اپنے موضوع پر بے نظیر سمجھی جاتی ہیں اور ابھی تک لاجواب ہیں۔

دوسری طرف آریوں نے جن کو حکومت وقت کی شہ مل گئی تھی، اسلامی عقائد والٰہیات پر حملہ شروع کر دیا اور عالم حدوث وقدم، ذات وصفات، کلام الٰہی حیات بعد الموت اور تناسخ، قبلہ اور حیات نبویؐ پر عقلی اعتراضات کرنے شروع کئے، ان کے جواب میں نہ تو قدیم کلامی دلائل پورے طور پر کارگر تھے نہ قدیم مقدمات اور قدیم اسلوب موثر تھا، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے ان کے جواب کے لئے ایک نیا علم کلام تیار کر دیا، انہوں نے روزمرہ کی ہلکی پھلکی زبان میں چھوٹی چھوٹی مثالوں اور عام فہم دلیلوں میں بڑے بڑے علمی مسائل سمجھائے اور بڑے بڑے مباحث کا فیصلہ کیا۔ تقریر دل پذیر، حجۃ الاسلام، آب حیات اور قبلہ نما ان کی ذہانت وسلامت فہم اور دقیقہ شناسی کا بہترین نمونہ ہیں، دوسری طرف انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں پنجاب میں ایک فتنہ کھڑا ہوا، یہ نبوت محمدیؐ کے خلاف ایک سوچی سمجھی بغاوت تھی اور اسلام کے پورے اعتقادی اور علمی وفکری نظام کو ڈائنامیٹ کرنے اور خدانخواستہ اس کے ملبہ پر ایک نئی نبوت اور امامت کے قصر کی تعمیر کی کوشش تھی اس کے مقابلہ میں چند مخلص اور بالغ نظر علماء میدان میں آئے جن میں مولانا محمد علی مونگیریؒ بانی ندوۃ العلماء اور مولانا سید انور شاہؒ کا نام اور کام سب سے زیادہ روشن ہے۔

زندگی کی رفاقت اور زمانہ کے تقاضوں کی تکمیل: یہ ساری تفصیل اس لئے سنائی گئی کہ آپ اندازہ کر سکیں کہ علماء اسلام کی ذہانت اور جذبۂ خدمت نے کبھی منزل پر قیام اور لکیر کا فقیر بننا گوارا نہیں کیا، انہوں نے علم کے چلتے پھرتے قافلہ کا ساتھ دیا، ان کا ہاتھ زمانہ کی نبض سے کبھی جدا نہیں ہوا، ان کی نگاہ زندگی کے بدلتے ہوئے تیوروں سے کبھی ہٹی نہیں، انہوں نے اسلام کی خدمت کے لئے جس زمانہ میں جس چیز، جس طرز اور جس اسلوب کی ضرورت سمجھی بلا تکلف اختیار کر لیا، انہوں نے اسلام سے وفاداری اور دین کی خدمت گزاری کا عہد کیا تھا، انہوں نے کسی مدرسہ فکر، کسی مکتب خیال اور کسی انداز فکر سے وابستگی کی قسم نہیں کھائی تھی۔ ہندوستان ومصر میں جب اسلام پر تمدن وتہذیب اور تاریخ وادب کی راہ سے حملے شروع ہوئے اور مغربی مصنفین اور مستشرقین نے اسلام کی مستند شخصیتوں اور اس کے معیاری عہد پر اعتراضات کئے اور اسلام کے خدوخال کو بگاڑ کر بدنما شکل میں پیش کیا تو طبقہ علماء ہی میں سے ایسے اہل قلم اور ادیب ومصنف آگے بڑھے جنہوں نے ان مضامین پر ایسی کتابیں لکھیں جو نہ صرف اسلامیات بلکہ اردو ادب میں بھی یادگار ہیں اور جنہوں نے جدید تعلیم یافتہ اصحاب میں سے ہزاروں کو نیا اطمینان اور دماغی سکون عطا کیا اور نہ صرف ان کا تذبذب دور ہوا بلکہ اسلام سے شیفتگی پیدا ہوگئی، مولانا شبلی کی الفاروق، الجزیہ فی الاسلام، کتب خانہ اسکندریہ اس سلسلہ کی کامیاب تصنیفات ہیں۔

نصاب تعلیم کے تغیرات: خود آپ کا نصاب تعلیم اس حقیقت کا گواہ ہے کہ علماء اسلام نے کسی ضرورت کے تسلیم کرنے اور کسی مفید وناگزیر چیز کو قبول کرنے میں کبھی پس وپیش نہیں کیا، یہ نصاب عہد بہ عہد تبدیلیوں اور مختلف علمی وعقلی رجحانات

کا نمائندہ ہے، اس میں ہر دور میں اضافہ وترمیم ہوتی رہی ہے، صرف یہ سو برس کا زمانہ ایسا ہے، جس میں اس نصاب میں کم سے کم تبدیلی ہوئی ہے حالانکہ یہی زمانہ اپنی سیاسی وذہنی تبدیلیوں کی بنا پر جائز اور ضروری تبدیلیوں کا سب سے زیادہ مستحق ومتقاضی تھا۔

دین کی نمائندگی کے لئے متنوع صلاحیتوں کی ضرورت: عزیزو! اس عہد انقلاب میں دین کی نمائندگی تعلیمات اسلام کی ترجمانی اور نہ صرف ان کی تشریح وتفہیم بلکہ ان کی بلندی وبرتری کا نقش قائم کرنے کے لئے بڑی وسیع تیاریوں اور بڑی متنوع صلاحیتوں کی ضرورت ہے، آپ اسلام کے سپاہی ہیں اور زندگی کے معرکہ کے لئے تیار ہورہے ہیں، کسی فوجی تربیت گاہ اور وہاں کی تیار ہونے والی فوج کے لئے سب سے زیادہ ناموزوں سب سے زیادہ خطرناک بحث، قدیم وجدید اسلحہ اور طریق جنگ کی بحث ہے، سپاہی کے لئے نہ کوئی ہتھیار قدیم ہے نہ جدید، اس کو تو یہ دیکھنا ہے کہ میدان جنگ کے لئے کون سا ہتھیار کارگر ہے اور کون سا طریق جنگ موزوں، تیار ہونے والے سپاہی کے لئے تعصب کی کوئی گنجائش نہیں، اس کا نہ کسی خاص اسلحہ سے رشتہ ہے نہ کسی خاص فن جنگ سے اس کو تو تمام ضروری اسلحہ سے مسلح ہونا چاہئے، عرب شاعر نے بہت پہلے کہا تھا:

کل امرئ یسعی الیٰ   یوم الھیاج بما استعدا

شراب کے حق میں بیان پر نیلوفر بختیار، اللہ سے معافی مانگیں، نیلوفر کا بیان دینِ اسلام اور آئینِ پاکستان دونوں سے غداری کے مترادف ہے، چوہدری شجاعت نیلوفر بختیار کے بیان کا فوری نوٹس لیں، نیلوفر بختیار کی سینٹ کی رکنیت ختم کی جائے۔ ان خیالات کا اظہار وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے ناظم اعلیٰ مولانا قاری محمد حنیف جالندھری نے نیلوفر بختیار کے بیان پر اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے کیا۔ انہوں نے کہا کہ نیلوفر بختیار اپنے اس بیان پر اللہ سے معافی مانگیں کیونکہ ان کا یہ بیان دینِ اسلام اور آئینِ پاکستان دونوں سے غداری کے مترادف ہے۔ انہوں نے کہا کہ نیلوفر بختیار عادی مجرم ہیں، انہوں نے فرانس میں پیرا گلائیڈنگ کے دوران پاکستان کی عزت کو خاک میں ملا کر رکھ دیا تھا اور اب وہ شراب پر سے پابندی ہٹوا کر ملک کے دینی اور آئینی تشخص کو مٹانے کی جسارت کر رہی ہیں، اس لیے انہیں اسلام کے نام پر معرض وجود میں آنے والے ملک کے ایوانِ بالا کی رکنیت کا کوئی حق حاصل نہیں ہے، ان کی رکنیت فی الفور کالعدم کی جائے۔ مولانا محمد حنیف جالندھری نے مسلم لیگ ق کی قیادت بالخصوص چوہدری شجاعت سے مطالبہ کیا کہ وہ نیلوفر بختیار کے اس بیان کا فوری نوٹس لیں۔ (پ۔ر)